ناولٹ: ابّا گردی

از قلم: ژیلہ ظفر

''ہک۔۔آہ'' پکے برآمدے میں لگے، کچے آموں کی درخت کے نیچے رکھی، خستہ حال مسہری پر بیٹھی امّاں جان نے سرد آہ بھری تھی۔ برآمدے میں ابّا حضور، کسی گھنٹے کے لٹکن کی مانند دائیں سے بائیں اور بائیں سے دائیں چکر کاٹ رہے تھے۔ برآمدے کے آخر میں بنے ستون کے ساتھ ٹیک لگائے ہم، یعنی ابّا کے ولی عہد یہ سارا منظر نامہ کچھ پریشانی اور کچھ نا سمجھی سے ملاحظہ فرمارہے تھے۔ ساتھ ہی ہمارا اکلوتا ماں جایا، شریف **(نام کا شریف اور کام کا پورا خبیث)** چوکڑی مارے فرش پر بیٹھا، اپنے جوتے رگڑنے میں مصروف تھا۔ اُسکی طرح اُسکے جوتوں کو بھی گھر کے مسائل سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔

جب شریف پیدا ہوا تھا، تب سے اُسکا اور ابّا کا اینٹ کتّے کا بیر تھا۔ نام کے اِس شریف نے بچپن سے ہی ابّا حضور کی ناک میں وہ دم کر کے رکھا تھا کہ شریکوں کے کلیجوں میں ٹھنڈ پڑنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جاتا۔ بقول ابّا، شیطان بھی جب تھک کر بیٹھ جاتا تھا، تب شریف کام شروع کرتا تھا۔ ویسے بات کوئی اتنی غلط بھی نہ تھی۔ اُسکے خرافاتی دماغ کا واقعی کوئی ثانی نہ تھا، ہمہ وقت کوئی نہ کوئی نیا چاند چڑھانے کے لیے تیار رہتا۔

زمانہ طالب علمی میں، جب نام کا شریف جامعہ سے بیچلرز کی سند لینے کے لیے مشقت کر رہا تھا، تب ایک استاد سے اُسکا مسئلہ ہو گیا۔ استاد نے بھی محاذ ہی کھول لیا۔ زندگی ایسی حرام کی کہ نام کے شریف پر ہمیں بھی کچھ کچھ رحم آنے لگا۔ وہ جتنی کوشش کرتا، اتنی ہی بار اُسکا پرچہ روک دیا جاتا۔

اُن دِنوں شریف نے نیا نیا کیمرہ خریدا تھا۔ کیمرے میں رول ڈال کر ہر جگہ کی تصویر کشی کرتے پایا جاتا، اُنہی دونوں اُسکے استاد بھی کسی اُستانی کے ساتھ اپنی جوانی کے دن تازہ کرتے اُسکے کیمرے کی آنکھ میں مقید ہو گئے، اور مزے کی بات یہ کہ استاد تھے بھی شادی شدہ اور بیگم اُنکی جامعہ کے ہی کسی دوسرے ڈیپارٹمنٹ میں ہیڈ ماسٹرنی تھیں۔ نام کے شریف نے تصاویر انہیں تو نہ دکھائیں، البتہ سیدھا استاد صاحب کے حوالے کیں اور انہیں یقین دلا آیا کہ اُسکے پاس مزید نیگیٹیو رول موجود ہیں۔ بس! پھر کیا تھا؟ اگلے سیمسٹر میں اُنکے پرچے میں نام کا شریف اتنا اوپر تھا کہ بس چاند پر قدم رکھنے کی قصر تھی۔

ابّا حضور کے تبادلے سے پہلے والے ہمارے پرانے محلّے میں ایک صاحب ہمارا بڑا ناک میں دم کیے رکھتے تھے۔ سب انہیں چچا شکورے کہتے تھے، کبھی اپنی کیاریوں کا مٹّی بھرا پانی ہمارے صحن میں پھینک دیتے تو کبھی کچرے سے بھرا تھیلا لا کر ہمارے دروازے پر ڈھیر کر دیتے۔ نام کا شریف ایک روز انہیں نماز پڑھانے کے لیے اپنی موٹر پر بٹھا کر لے گیا۔ چچا شکورے پیدل آنا جانا کرتے تھے، بڑے خوش ہو کر موٹر پر سوار ہو گئے۔ اُسکے بعد شریف کی تو باخیر وعافیت واپسی ہو گئی، پر چچا شکورے تین دن بعد پہنچے۔ چونکہ اِس واردات کے اکیلے شاہد ہم ہی تھے، لہٰذا تین دن تک تو محلے والوں کو شک بھی نہ گزرا۔ جب چچا شکورے تین روز بعد گھر پہنچے، تب اُنکے باآوازِ بلند کوسوں اور طعنوں نے یہ راز فاش کیا کہ شریف انہیں مسجد کے بہانے شہر سے دور قصبے میں چھوڑ آیا تھا۔ نہ موبائل کا زمانہ نہ انٹرنیٹ کا، اوپر سے چاچے کو علاقوں کا نام بھی یاد نہ رہتا تھا۔ خُدا جانے کتنی مشکلوں کے بعد قصبے والوں کے ترلے کر کے، اور کتنی مشکلوں سے لفٹ لیکر تین دن بعد گھر پہنچے۔ چاچے کے لڑکے تھوڑے معقول تھے، ذرا ڈانٹ ڈپٹ کے بعد ہی معاملہ رفع دفع کر دیا۔ لیکن اس واقعے کے بعد چاچے کے کس بل اچھی طرح بیٹھ گئے۔ پھر نہ صحن میں کوئی پانی آیا اور نہ دروازے پر کوئی کچرے کا تھیلا۔

ابّا حضور کی نظر میں ہم کچھ فرمانبردار تھے، کیونکہ ہم سر جھکا کر ہر بات مان لیا کرتے تھے، جبکہ نام کا شریف بحث برائے بحث میں اُلجھا رہتا۔ ابّا حضور کو جب بھی کوئی ملنے جلنے والا کہتا کہ "بھائی تمیز الدین! تمہارے دونوں بیٹوں کا تعارف تو کرواؤ۔"

تو ابّا حضور جو اباؔ دونوں بیٹوں کا تعارف کچھ اسطرح کرواتے کہ "کہنے کو تو دونوں ہی میری اولاد ہیں، پر زمین آسمان کا فرق ہے دونوں میں۔" پھر ہاتھ سے شریف کی جانب اشارہ کرتے اور کہتے کہ "ایک یہ ہے، جھوٹے منہ بھی باپ سے کسی کام کی اجازت نہیں لیتا ہے۔ اپنی من مانیاں کر کے بس اطلاع دے جاتا ہے اور ہمارے اجداد پر احسان کرتا ہے۔ بیغیرت!" اور بیغیرت دانت نکالے ہنستا رہتا۔ پھر ابّا حضور ہاتھ سے ہماری جانب اشارہ کرتے اور کہتے کہ "اور دوسرا یہ ہے، اتنا فرمانبردار کے قضائے حاجت کے لیے بھی ہم سے اجازت لیکر جاتا ہے۔" اُسکے بعد مہمانوں کی بتیسی دیکھ کر ہمیں یہ اندازہ کرنا مشکل ہو جاتا کہ وہ شریف کی بے عزتی پر ہنس رہے ہیں یا ہماری تعریف پر؟ ایسی تعریف سے تو شریف کی بے عزتی ہی بھلی تھی۔

فلحال، مدعا وہ خط تھا جو گھنٹے کے لٹکن کی مانند چکر کاٹتے، ابّا جی کے ہاتھوں میں مقید تھا۔ اس ایک خط نے ہمارے گھر کی در و دیواریں ہی ہلا دی تھیں۔

خط تین روز قبل بذریعہ ڈاک ارسال کیا گیا تھا، جو آج کی تاریخ میں موصول ہوا تھا۔ خط کا کاغذ، ہلکے پیلے رنگ کا اور دبیز تھا، جبکہ متن سبز رنگ کی روشنائی سے تحریر کیا گیا تھا۔ وہ بھی اپنی نوعیت کا عجیب مگر منفرد خط تھا۔ جو ہمارے دادا جان کی طرف سے ابّا حضور کے نام آیا تھا۔

''برخودار!

نرے ہی بیغیرت ہوئے بیٹھے ہو۔ بہن کا حصہ کھا کر شرم نہ آئی؟ سن لو! اپنے برابر میں ہی تمہارے لیے زمین مختص کرلی ہے۔ یہاں سے تمہاری والی زمین کا منظر واضح نظر آرہا ہے۔ بہن کو حصہ نہ دینے پر جو سانپ اور بچھو میں دیکھ رہا ہوں، تم دیکھ لیتے تو اپنا حصہ بھی بہنا کو دے دیتے۔ بدبخت! فوراً گڑیا کو اُسکا حصہ دے۔ تجھے یہاں بلوانا ہے، اپنا اعمال نامہ جلد از جلد صاف کر کے آ۔''

اور بس! خط ختم۔۔۔ خالص دادا جی کا ہی لہجہ تھا، اور لکھائی بھی اُنہی کی۔

''یہ مذاق جس نے بھی کیا ہے، بڑا ہی بے ہودہ ہے۔'' مسہری پر ٹانگ پسارے بیٹھیں اماں نے کہا تو ابّا سے تھا لیکن گھورا جو تار گڑتے اپنی اولاد شریف کو تھا۔

''نہیں نہیں! یہ مذاق نہیں ہے۔۔۔ کیونکہ لکھائی بالکل ابّا کی ہے۔'' ابّا حضور نے ماتھے پر سے پسینہ صاف کرتے ہوئے کہا۔

ہم نے ایک نظر تاسف سے اپنے ماں جائے کو دیکھا، جواب تک جوتا چمکانے میں مصروف تھا۔ یہ بے ہودہ مذاق یقیناً وہی کر سکتا تھا۔ کیونکہ دادا جی کو مرحوم ہوئے بھی دس سال بیت چکے تھے۔

----------+---------+--------

دادا جی اُتر بہار کے رہنے والے تھے، جبکہ نانا جی لکھنئو کے۔ دونوں کی ملاقات دورانِ ہجرت ہوئی اور پھر یہ ملاقات دوستی میں بدل گئی۔ دادا جی اور نانا جی دونوں ہی مشرقی پاکستان کے شہر ڈھاکہ آکر آباد ہوئے، لیکن قسمت کو یہاں سے بھی ہجرت منظور تھی۔ لہٰذا سقوطِ ڈھاکہ کے بعد دادا جی کراچی جبکہ نانا جی پنجاب کے گاؤں ننکانہ صاحب آکر آباد ہوگئے۔ لیکن دوستی میں ڈرار نہ آئی۔ خط و کتابت کا سلسلہ چلتا رہا۔ نانا جان نے اپنے زیورات بیچ کر ننکانہ صاحب میں زمینیں خرید لی تھیں، اور زمینوں پر اناج اُگا کر گزر بسر کیا کرتے تھے، جبکہ دادا جی نے کراچی میں سرکاری نوکری کے لیے درخواست دی تھی اور پھر وہ کلرک لگ کر ہمیشہ کے لیے یہیں کے ہوگئے۔

جب دادا مرحوم کی منجھلی اولاد، یعنی ہمارے ابّا اپنے خاندان میں سب سے زیادہ پڑھ لکھ کر سرکاری کالج میں ماسٹر لگ گئے، تو دادا مرحوم نے بنا دیکھے ہی اپنے دوست سے اُنکی بیٹی کا ہاتھ مانگنے کے لیے خط لکھ دیا۔ لکھنو کی اردو بولنے والی سلیقہ مند اور سادہ سی امّاں ہمارے ابّا کو بھی بڑی پسند آئیں، دوسری جانب پڑھے لکھے اور خوبرو سے ابّا کو امّاں سے بھی قبل، نانا جی نے پسند کر لیا اور یوں امّاں سسرال سدھار گئیں۔

امّاں ابّا کی پہلی اولاد ہم یعنی قمرالدین کے پیدا ہونے کے بعد سے ابّا کے پیروں میں تبادلوں کا وہ پہیہ لگا کہ وہ ہمارے سیکنڈری کے زمانے میں آ کر ہی تھما، جب ابّا مستقل فیصل آباد کالج کے ہیڈ لگ گئے۔ ہم سے فقط دو سال چھوٹا بھائی شریف الدین تھا، جسکے کارنامے پہلے ہی بیان ہو چکے ہیں۔ شریف الدین کو اِسکے نام سے بلاتے بھی ہمیں شرم آتی تھی، لہٰذا ہم نے اسکا اسمِ گرامی تبدیل کر کے شری (ہمارے مطابق شر پھیلانے والا) کر رکھا تھا۔ یہ اُسکے مزاج سے میل بھی کھاتا تھا۔

ویسے تو ابّا حضور اپنے بیوی اور بچوں کے حق میں بڑے بہترین تھے، ہر طرح کی آسائش اور عیاشیوں سے زندگی بھر رکھی ہوئی تھی۔ پر عمر بڑی ہونے کے ساتھ ساتھ جب ذہن شعور کی منزلوں کو پہنچا، تو ادراک ہوا کہ ابّا حضور ہمارے حق میں جتنے اچھے ہیں، دوسروں کے حق میں اتنے ہی غاصب، فرعون اور مکار ہے۔ ابّا حضور کی واحد محبت پیسہ، پیسہ اور بس پیسہ ہی تھا۔ اللہ کا دیا سب کچھ ہونے کے بعد بھی ابّا حضور کی چاہت ہوتی کہ جسکی جیب میں جو موجود ہے، وہ بھی اُنکا ہو جائے۔ شروع شروع میں تو ہمیں یہ بات اتنی قابلِ اعتراض نہ لگتی، لیکن جب وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ابّا حضور کے کارنامے کھل کر سامنے آئے تو ہم شرم سے پانی پانی ہو گئے۔

ابّا حضور نے اپنے کچھ ہم عصروں کے ساتھ کمیٹیاں ڈال رکھی تھیں، اس کمیٹی کے خود ساختہ مالک بھی وہی تھے۔ تمام کمیٹی کے پیسے اُنہی کے پاس آ کر جمع ہوتے۔ اصولاً جسکی باری ہوتی اُسکو رقم مہینے کی پانچ کو ملنی ہوتی۔ ابّا نے پابندی لگا رکھی تھی کہ ہر شخص اپنی کمیٹی کے پیسے مورخہ پانچ سے پہلے ہی جمع کروا دے۔ مورخہ پانچ اور اِسکے بعد آنے والے پیسوں پر ابّا جرمانہ لیا کرتے تھے۔ چاہے آنے والا اپنی بے بسی اور تنخواہ دیر سے آنے کا کتنا ہی رونا روتا، اُنکا دل نہ پگھلتا۔ ماہانہ پچاس روپے جمع ہونے والی کمیٹی پر ابّا دس روپے جرمانہ لیا کرتے۔ اُس زمانے میں ایک بڑے سرکاری افسر کی تنخواہ بھی ڈھائی سو روپے ہوا کرتی تھی، اور دو آنے میں ایک سیر آٹا مل جایا کرتا تھا۔ ایسے میں دس روپے جرمانہ بھرنے پر دینے والے کی چیخیں نکل جاتیں۔

zeelazafar.com

لیکن یہی اصول ابّا کے خود کے لیے تبدیل ہو جاتا۔ پانچ تاریخ کو ادا کی جانے والی کمیٹی کو ابّا، جان کر کھینچتے کھینچتے پچیس تک لے جاتے۔ جس بیچارے کی باری ہوتی، وہ دروازے کے چکر کاٹ کاٹ کر چلا جاتا اور ابّا اُسکے پیسوں سے پہلے گھر کے کام کرواتے، پھر ادائیگی کرتے۔ ایک مرتبہ کسی شاطر دماغ سے پالا پڑ گیا۔ اُس نے پانچ تاریخ کی کمیٹی پندرہ تاریخ کو ملنے پر ابّا پر سو روپے کا جرمانہ عائد کر دیا، پہلی کمیٹی بھی اُسی کی تھی، جرمانہ نہ دینے کی صورت میں اُس نے بقیہ مہینوں کی ادائیگی کرنے میں، ابّا کا وہ جینا حرام کیا کہ اُنکا یہ کمیٹی کا دھندہ ہمیشہ کے لیے ہی بند ہو گیا۔

سیکنڈری ختم کر کے جب ہم فیصل آباد کالج پہنچے تو معلوم ہوا کہ اس کالج میں ابّا کے مضمون میں پاس ہونا بہت مشکل ہے۔ اُنکے پرچوں میں آدھی جماعت فیل ہوا کرتی تھی اور یہ بات خود ابّا نے استقبالیہ تقریب میں کھڑے ہو کر فخریہ بتائی تھی۔ کالج میں جب نصاب کا آغاز ہوا تو کئی سابقہ طلبہ ابّا کو راہداریوں میں بددعائیں دیتے نظر آنے لگے۔ معلوم کرنے پر پتہ چلا کہ ابّا نے سب کے پرچے روک رکھے ہیں۔ حالانکہ کالج کے اندرونی امتحانات سے بورڈ کے پرچوں کا کوئی تعلق نہ تھا۔ لیکن ابّا حضور نے یہ خود ساختہ قانون بنا رکھا تھا کہ جو اِنکے پرچوں میں کامیاب نہیں ہو گا، اُسے بورڈ کے امتحان میں بیٹھنے کے لیے داخلہ کارڈ فراہم نہیں کیا جائے گا اور ابّا نے اِس طرح کر کے نجانے کتنے ہی طالب علموں کا سال برباد کیا تھا۔

جب ابّا کا پرچہ دینے کی باری، ہماری آئی تو معلوم ہوا کہ کسی ذی عقل نے ابّا کے مضمون کے پچھلے پانچ سالہ تمام پرچہ جات اکھٹے کر رکھے تھے اور وہ ہر سال اُسکی نقل دو دو آنوں میں لوگوں کو بیچتا تھا۔ مارے تجسس کہ ہم نے بھی وہ پرچے خرید لیے۔ یہ دیکھ کر ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ پانچ سالوں سے ابّا حضور ایک ہی پرچے سے کام چلا رہے تھے۔ حتیٰ کہ سوالات کے مقام بھی تبدیل نہیں کیے گئے تھے، جو سوال پہلے نمبر پر تھا وہ پانچ سال بعد بھی بدستور وہیں موجود رہا۔ ہمارے سمجھ نہ آئی کہ جب ہر سال طلباء کو معلوم ہوتا کہ پرچہ یہی آنا ہے، تو پھر اتنی بڑی تعداد کیسے فیل ہو جاتی تھی؟ یہ عقدہ تب کھلا جب ابّا کے پرچے میں، ہم اچھے نمبروں سے پاس ہو گئے اور باقی تمام دوست فیل، ہم نے اُنکے ہاتھوں اُنکا جوابی پرچہ لے کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ فقط، ایک جمع تقسیم کے نشان کو غلط لکھنے پر ہی ابّا نے منفی پانچ عدد کاٹ رکھے ہیں۔ جی ہاں! منفی پانچ۔۔۔ اور یہ منفی اعداد ہر سوال میں دے کر قرضے میں سود کی طرح نمبروں کو کاٹا گیا تھا۔ ہمیں بڑا افسوس ہوا، پر نام کے شریف اپنے بھائی کی طرح ہماری اتنی ہمت نہ ہوئی کہ اُنکو کچھ کہہ بھی سکتے۔

کالج کے آخری سال ابّا نے ہمارے ایک دوست کو فیل کر دیا۔ بیچارہ سارا دن روتا رہا، ہمیں اس پر دل بھر کر ترس آیا تو ابّا کے خلاف جانے کا سوچا۔ چھپ چھپا کر ابّا کے کمرے سے اُسکا داخلہ کارڈ اُڑا لائے اور اسکے حوالے کر دیا۔

''اب خاموشی سے جا کر بورڈ کے امتحانات دے دینا۔'' اپنی جانب سے ہم نے سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے والا کام کیا تھا، کیونکہ ہم نام کے شریف کی طرح ڈنکے کی چوٹ پر کام نہیں کرتے تھے۔ لیکن اپنی عقل پر ماتم تب کیا، جب دو چار سابقہ طالب علموں سے ملاقات ہوئی۔ انکے یہاں ہونے کی وجہ دریافت کی تو معلوم ہوا کہ اپنے زمانے میں ابّا نے اُنکو بھی فیل کر کے، انکا داخلہ کارڈ روک لیا، اور کہا کہ جب میرے پرچے میں پاس نہیں ہو سکتے تو بھلا بورڈ میں کیا ہی تیر مارو گے؟ چلو! ایک سال اور محنت کرو۔

اُنہوں نے بھی سر جھکا کر اُنکی بات سنی اور بعد میں جا کر داخلہ کارڈ کی نقل بورڈ آفس سے نکال لائے۔ ابّا کو معلوم ہوا تو انہوں نے پہلے خون کے گھونٹ بھرے کہ بورڈ میں انکا حکم نہیں چل سکتا تھا۔ لیکن جب نتیجہ آیا اور مارکس شیٹ کالج پہنچی تو ابّا نے وہ روک لی، یہ سابقہ طالب علم بھی نرے بدمعاش تھے۔ مارک شیٹ کی بھی بورڈ سے نقل نکلوا لائے۔ اب تو ابّا پیچ و تاب کھانے لگے۔ اصل مسئلہ تب آیا، جب ان بیچاروں کو جامعہ میں داخلہ لینے کے لیے اپنا بہترین اور شریف النفس کردار ثابت کرنے کی ضرورت پیش آئی اور اسکے لیے کالج کی گواہی درکار تھی۔ اب وہ بیچارے **اب آیا اونٹ پہاڑ کے نیچے** کی مصداق ایک بار پھر ابّا کے در پر کھڑے تھے۔

کالج سے نکلنے کے بعد ہم پر یہ انکشاف ہوا کہ ابّا اکثر طالب علموں کا پرچہ نظرثانی کر کے انہیں پاس کر دیا کرتے تھے اور اِس نظرثانی کے لیے وہ بطور اعزازیہ تیس روپے لیا کرتے تھے۔ ہمیں تو جب معلوم ہوا، اُسی وقت شرم سے پانی پانی ہوئے پھرنے لگے۔ اوپر سے ہمارے ابّا کے پرچے میں اچھے نمبر آنے پر دوستوں کی چبھتی نظروں نے، ہمیں اس بات پر راضی کر لیا کہ ہم اپنے ماں جائے کو بھی یہیں داخلہ دلوائیں۔ ہم نے سہا ہے تو اُسے کیوں چھوڑیں؟ مگر نام کا شریف عقل کا بڑا تیز تھا، اُس نے جی سی یو میں داخلہ لے لیا مگر فیصل آباد کالج کا رخ نہ کیا۔

اُدھر ہم نے بارہویں کے امتحان دیے اور اِدھر دادا جان عدم سدھار گئے۔ ہمیں بڑا دکھ ہوا کہ دادا کے سب سے قریب ہم ہی تھے۔ ابھی ہم صحیح سے دکھ منا بھی نہ سکے تھے کہ ابّا کی ایک اور ابّا گردی ہمارے سامنے آئی اور اِس بار تو ہمیں کسی کو منہ دکھانے لائق نہ چھوڑا۔ ابّا کے بڑے بھائی یعنی ہمارے تایا اپنی شادی کے فقط سال بھر بعد ہی چیچک سے وفات پا گئے۔ جوان سالہ بیوہ تائی نے بھی پھر کسی سے شادی نہ کی بلکہ خاموشی اور صبر و شکر کے ساتھ اپنی بیٹی کو پالنے لگیں۔ دوسری جانب ہماری اکلوتی پھپھو اور ابّا کی سب سے چھوٹی بہن بھی شادی ہو کر

تونسہ شریف جابسی تھیں۔ چھٹیوں پر ہمیشہ رہنے آیا کرتی تھیں۔ وہ بیاہ کے داداجان کے بھائی کے گھر ہی گئی تھیں، پھوپھا، دادا کے سگے بھتیجے تھے۔

خیر! دادا کے مرتے ہی جب وراثت کا معاملہ آیا تو ابّا نے کہا کہ شریعت میں ورثاء وہی ہوتے ہیں جو زندہ ہوں، لہٰذا بڑے بھیّا کا کوئی حصہ نہیں،اور پھپھو کو جہیز کے نام پر کافی کچھ دے دیا ہے، لہٰذا انکا بھی کوئی حصّہ نہیں۔ بڑے تایا کے متعلق بے شک ابّا کی بات درست تھی، لیکن دادا مرنے سے پہلے اپنی جائیداد کے تیسرے حصے میں سے ایک دکان اپنی یتیم پوتی کے نام کر گئے تھے، خود پھپھو کو جہیز کے نام پر کچھ سونے کی چیزیں ہی دی گئی تھیں کہ پھوپھا نے کسی بھی قسم کا گھریلو سامان لینے سے صاف انکار کر دیا تھا،اور یہ سونے کا سیٹ دادی نے تحفتاً دیا تھا، جسکا جائیداد سے کوئی تعلق نہ تھا۔ ابّا نے وہ حصہ بھی ہڑپ لیا جبکہ پھپھو کے حصے سے ہمیں پڑھنے کے لیے باہر بھیج دیا گیا۔ شرم سے منہ چھپاتے ہم بیرونِ ملک آ گئے، چار سال باہر پڑھنے کے بعد ہم نے وطن واپسی کی راہ لی، گو کہ ابّا حضور ہمارے واپسی کے فیصلے کے سخت خلاف تھے۔ لیکن پہلی بار ہم نے انکا حکم نہ مانتے ہوئے پاکستان میں رہنے کو ترجیح دی کہ باہر کی دنیا میں امّاں ابّا اور کہنا نہیں چاہتے پر اپنا نام کا شریف بھائی بڑا یاد آتا تھا۔

خیر! واپس آئے تو اپنے شاندار تعلیمی ریکارڈ اور قابلیت کی بنا پر وفاقی ادارہ برائے محصولات میں سترہ گریڈ کے افسر لگ گئے۔ ہمیں اتنے اچھے عہدے پر دیکھ کر ابّا کا دکھ تھوڑا کم ہوا۔ البتہ ہر ملنے جلنے والا یہی سمجھتا تھا کہ ہماری نوکری میں ابّا کے تعلقات کا عمل دخل ہے۔

واپس ملک آئے تو احساس ہوا کہ ابّا کی ابّا گردی میں مزید اضافہ ہو چکا ہے۔ سرکار نے جو گھر ہمیں دیا تھا ہم امّاں، ابّا اور شریف کو وہیں لے کر منتقل ہو گئے تھے۔ وہ گھر جو ابّا کا تھا، اور تیسرا گھر جو دادا ورثے میں چھوڑ گئے تھے وہ ابّا نے کرائے پر اُٹھا دیا۔ ہم بس، کف افسوس ہی ملتے رہے پر کچھ کہہ نہ سکے۔

ابّا کا حال کچھ یوں ہو چکا تھا کہ پیسوں کی محبت نے اب انہیں بخل بنا دیا تھا۔ کام والی آتی تو سارے گرم پانی کے نل بند کر دیئے جاتے، سخت سردی میں وہ ٹھنڈے پانی سے کپڑے دھوتی، ایک روز بیچاری مارے ٹھنڈ کے اپنے ہاتھ ملنے لگی تو ہمیں ترس آ گیا۔ پہلی بار ذرا لہجے میں خفگی سمو کر پوچھا کہ

""اگر وہ گرم پانی سے کپڑے دھو لیں گی تو کیا ہی ہو جائے گا؟""

''پانی سے کپڑے کم دھوتی ہے اور بہاتی زیادہ ہے۔ سارا دن گیس خرچ کر کے گیزر اس لیے تھوڑی چلایا ہے کہ پانی ایسے ضائع کر دیں۔''

ابّا نے کہا۔

''تو گیس کا بل تو حکومت نے ہمیں مفت کیا ہوا ہے۔ اور اگر وہ پانی بہاتی ہے تو آپ بالٹیوں میں بھر کر اُسے دے دیں کہ بس اتنے ہی پانی سے دھو۔ اس طرح سردی میں اتنے برفیلے پانی سے اُسے کپڑے دھونے کو کہنا جبکہ گرم پانی موجود ہے، یہ کہاں کا انصاف ہے ابّا؟ آپ کے گھر سے اگر وہ تھوڑے گرم پانی سے کپڑے دھولے گی تو آپکا کیا ہی نقصان ہو جائے گا؟ آپ دوسروں کے لیے آسانی کریں گے تو اللہ آپکے لیے آسانی کرے گا۔'' ہم نے نرمی سے سمجھانا چاہا۔

''تُو نہ سکھا مجھے، چار جماعتیں باہر سے کیا پڑھ آیا ہے، اپنے آپ کو مجھ سے بڑا سمجھنے لگا ہے؟ چل جا، کام کر جا کے اپنا۔'' ابّا حضور کو تو سمجھ نہ آئی پر امّاں کو یقیناً آ گئی تھی، اس لیے اگلے روز سے جب کام والی آئی تو امّاں نے ابّا کے علم میں لائے بنا ہی گرم پانی کے نلکے کھول دیئے۔

ابّا پانچ وقت کی نماز جماعت سے پڑھتے تھے۔ محلّے میں اپنی نیکی کی دھاک بٹھانے کے لیے اکثر درس و دروس کی محافل میں بھی جاتے۔ پر اپنا کچرا پڑوس والوں کے دروازے پر رکھنا نہ بھولتے کیونکہ جمع دار کو ہم نے اپنے گھر نہیں رکھوایا ہوا تھا، بقول ابّا حضور کون اُسے ماہانہ ایک روپیہ بھرے؟ خیر! جب گھر کا کچرا پڑوسی عبدالرحمن کے گھر کے باہر رکھ دیا جاتا تو جمعدار اُسے عبدالرحمن کا ہی کچرا سمجھ کر اُٹھا لے جاتا، اور اُس بیچارے کے گھر کا کچرا گھر میں ہی رہ جاتا۔ کچھ روز تو اُسے سمجھ نہ آئی پر جب آ گئی تو اُس نے ٹھیک ٹھاک وبال کھڑا کیا۔ ابّا بھی ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکالتے ہوئے ہمیں ساتھ لیے مسجد آ گئے۔ ہم شرم سے ایک بار پھر چہرہ چھپاتے وضو خانے میں آ گئے۔ جب نماز کے لیے صف بندھی، تو معلوم ہوا آگے والی صف میں ہی عبدالرحمن بھائی کھڑے ہیں، اب تو مارے شرمندگی سے ہمارا حال ہی برا ہو گیا۔ مگر مجال ہے جو ابّا حضور کو ایک انچ کا بھی فرق پڑا ہو؟ نماز مکمل ہوتے ہی امام صاحب سے بھی بلند آواز میں دعا شروع کر دی۔

''اے اللہ! ہمارے گناہ معاف کر دے۔۔۔ اے اللہ! ہم تیرے گنہگار بندے۔۔۔'' بولتے بولتے ابّا حضور کی ہچکیاں بندھ گئی۔ سوائے میرے اور عبدالرحمن بھائی کے باقی نمازی رشک سے رو رو کر اپنے گناہ بخشواتے ابّا حضور کو دیکھنے لگے۔ کیونکہ عبدالرحمن بھائی سخت تاسف سے ہمیں، جبکہ ہم بیزار نظروں سے ابّا حضور کو دیکھ رہے تھے۔ اور پھر ہم نے وہی کیا جو ہمیشہ سے کرتے آئے ہیں۔ دونوں ہاتھ دعا کے انداز میں اُٹھا کر چہرے کو ڈھانپ لیا، تاکہ عبدالرحمن کی نظروں سے بچا جا سکے۔ پر رحمٰن سے کیسے بچتے؟

----------+---------+--------

''ہونہ ہو یہ تمہارے ہی خرافاتی دماغ کی کارستانی ہے۔''ہم نے لوہے کے پلنگ پر چوکڑی مارے بیٹھے شریف کو دیکھ کر کہا۔

''بھلا ہم یہ کیوں کریں گے؟''پیالے میں سے امرود کی کاشیں اُٹھا اٹھا کر منہ میں ڈالتا شریف بولا۔

''کیونکہ تمھیں ہی ایسی بیہودہ حرکتیں کرنے میں سند حاصل ہے۔''ہم نے جتایا۔ نام کے شریف کو مطلق فرق نہ پڑا۔ ہم دونوں اِس وقت اپنے مشترکہ کمرے میں موجود تھے۔ دادا جان کا خط دیکھ کر جو ابّا کو پسینے آئے تو اُن کا فشار خون بلند کر کے ہی گئے۔

''آپ کے پاس کوئی ثبوت ہے کہ یہ ہم نے کیا ہے؟''

''تمہاری پوری زندگی ہی سراپا ثبوت ہے۔''ہم نے گھور کر کہا۔

''پر یہ ہم نے نہیں کیا۔''اس بار شریف سنجیدگی سے بولا۔

''تو اور کون کر سکتا ہے؟''ہم نے پوچھا۔

''نہیں تم یہ بتاؤ! کہ ہم یہ کیسے کر سکتے ہیں؟''وہ اب کہ برا مان گیا۔

''کیونکہ تم دوسروں کی لکھائی کی نقل اُتارنے میں ماہر ہو۔''ہم نے یاد دلایا۔ شریف کو دوسروں کی لکھائی کی نقل اُتارنے میں مہارت حاصل تھی، اسکول کے دنوں میں کتنی بار ابّا کی لکھائی میں اُس سے درخواستیں لکھوائیں تھیں۔ حتیٰ کہ زمانہ طالب علمی میں اپنے اسائنمنٹ بھی اُس سے ہی بنواتے کہ وہ ہماری لکھائی پوری کی پوری چھاپ لیا کرتا تھا، پر یہ کام اُس نے کبھی فی سبیل اللہ نہیں کیا۔ ابّا کا فرزند ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے ہمیشہ ہم سے اعزازیہ وصول کرتا تھا۔

''لکھائی تو تم نے بھی چھاپنا سیکھی ہے ہم سے۔۔۔''اُس نے جتایا۔ کچھ عرصے قبل ہم نے بھی اُس سے یہ خداداد صلاحیت سیکھنے کی کوشش کی تھی۔

''ہاں! پر ہم تمہاری طرح ماہر نہیں ہیں۔ تم ہی اتنی مہارت سے دادا کی لکھائی نقل کر سکتے ہو۔''ہم ماننے کو تیار نہ تھے۔

''چھوڑو جس نے بھی کیا ہو، تم کیوں اتنے پریشان ہو؟ کون سا اُس خط کے بعد ابّا نے پھپھو کا حصہ انہیں دے دینا ہے۔ وہ بیچاری بھی دادا کے انتقال پر جو روٹھ کر گئی آج دس سال ہونے کو آئے واپس نہیں آئیں۔''اُس نے دکھ سے کہا۔

''لیکن ابّا ہمیں سنجیدہ نظر آرہے ہیں۔ لگتا ہے انہیں تھوڑا تھوڑا موت کا خوف بھی آنے لگا ہے۔ کیا معلوم پھپھو کو بلا کر انکا حصّہ دے دیں؟'' ہم نے پُر امید لہجے میں کہا۔

''بھول ہے آپکی، ابّا حضور مر جائیں گے پر پیسوں کے معاملے میں کسی پر رحم نہیں کھائیں گے۔ تم دیکھ لینا، کل تک اِسکا کوئی نیا حل نکال چکے ہوں گے۔'' نام کا شریف کہتے ہوئے کمبل میں گھس گیا۔ اور ہم اُسکی باتوں پر غور کرنے لگے کہ دیکھو! کل کونسا نیا چاند چڑھتا ہے؟

----------+---------+--------

اگلی صبح جو خبر ہماری منتظر تھی، اُس نے ہمارے چھکّے چھڑا دیئے۔ ابّا نے ساری رات جاگ کر یہ فیصلہ کیا کہ پھپھو کی اکلوتی بیٹی کو ہمارے سر منڈھ دیا جائے تاکہ پھپھو کو دی جانے والی جائیداد اُسکے حق مہر میں لکھوا کر اُسے کبھی حق مہر ادا ہی نہ کیا جائے، اور جائیداد واپس ہمارے پاس ہی رہ جائے۔ پہلی بار ہم ابّا کی عقل پر عش عش کر اٹھے۔ نام کا شریف صحیح کہتا تھا، ابّا مر جائیں گے پر پیسوں کے معاملے میں کسی پر رحم نہیں کھائیں گے۔ جب سے ہم نے یہ فیصلہ سنا تھا دل تھا کہ حلق میں آیا جا رہا تھا۔ اوّل تو ہم نے ابھی شادی کا سوچا نہیں تھا، اوپر سے پھپھو کی اکلوتی بیٹی چندا کو آخری بار دس سال قبل دادا کے انتقال پر ہی دیکھا تھا۔ بارہ سال کی تھی پر اپنی ذہانت اور تعلیم میں اچھے ہونے کی بنا پر آٹھویں کی طالبہ تھی۔ سنا تھا کہ بی ایڈ کر کے پچھلے تین سالوں سے کسی اسکول میں پڑھا رہی تھی۔ پر ہمیں کیا پرواہ؟ ہمیں تو وہ بلا وجہ اپنے قد سے لمبا پراندہ جھلاتی چندا یاد آگئی۔ جسکا بچپن میں، ہم اور نام کا شریف ''چندا چاند کی بیٹی، طوطا ہاتھ میں لیتی'' گا گا کر جینا حرام کیے رکھتے تھے۔

ابھی ہم اس اچانک فیصلے سے نکل بھی نہ پائے تھے کہ گھر کا کونا کونا چمکاتی امّاں حضور پر نگاہ پڑی۔

''یہ تیاری کس لیے امّاں؟'' ہم نے ڈرتے ڈرتے پوچھا کہ آیا آج ہی نکاح نہ پڑھا دیں ہمارا۔

''تمہاری پُھپھی آرہی ہیں چندا کے ساتھ۔ تمہارے ابّا نے صبح ہی ٹیلیفون کر کے بلوایا ہے۔'' امّاں نے نیا بم سر پر گرایا۔

''ایسی بھی کیا جلدی امّاں؟'' ہم بیزار ہوئے۔

''ارے! ابھی اُسے بتایا تھوڑی ہے کہ کس مقصد سے بلا رہے ہیں؟ وہ بات تو اُسکے آنے کے بعد کریں گے۔'' امّاں نے بتایا، یعنی بیچاری گڑیا پھپھو، ابّا کے بلانے پر خوشی خوشی آرہی تھیں، انکو تو ابّا کی سازش کا اندازہ بھی نہ تھا۔

''نہ امّاں! آپ ہمیں یہ بتائیں کہ ابّا کو ہماری اور چندا کی شادی کا مشورہ دیا کس نے؟'' ہم نے تپ کر پوچھا۔

''شریف نے۔۔۔'' اُنہوں نے مصروف سے انداز میں جواب دیا۔

''کیا؟ شری نے؟'' ہمیں اپنی سماعتوں پر شک گزرا۔

''ہاں ہاں! شریف نے۔۔۔ پہلی بار تو کوئی ڈھنگ کا مشورہ دیا ہے۔'' امّاں خوشی سے بتانے لگی۔ اور ادھر چراغوں میں روشنی ہی نہ رہی۔

----------+---------+--------

''بے شرم! خبیث! شیطان کے کارندے۔۔۔۔'' ہم جوتا، چپل، بلا جو شے ہاتھ میں آتی شریف کو دے مارتے۔

''ارے! پر ہم نے کیا کیا ہے؟'' خود کو بچاتا شریف بولا۔

''ہمیں چندا کے ساتھ پھنسا کر معصوم بن رہے ہو؟'' مسہری کے پیچھے کھڑے شریف کو پکڑنے کے چکر میں ہم گرتے گرتے بچے پر وہ ہاتھ نہ آیا۔

''ہم نے تو بس ابّا کا مسئلہ حل کیا ہے۔'' وہ معصوم بنتا زینے کی جانب بھاگا۔

''یہ پیسوں کے معاملے میں تمہارے اور ابّا کے تعلقات مثالی کیوں ہو جاتے ہیں؟'' ہم نے بھی اُسکے پیچھے زینے کی جانب دوڑ لگائی۔ وہ دوڑتا دوڑتا چھت پر پہنچا، ہم نے بھی چھت پر قدم رنجا فرمائے اور اُسے گدّی سے پکڑا، لیکن نام کا شریف ورزشیں کر کر کے خود کو کسرتی بنا چکا تھا۔ ایک ہی جست میں ہمیں دھکّا دیتا بھاگ نکلا۔ لیکن افسوس! آگے جا کر چھت ہی ختم ہو گئی۔ اب چھت کی منڈیر تھی اور ہم، اور درمیان میں کھڑا شریف۔

''اب کون بچائے گا تمہیں؟'' ہم نے جگا ڈاکو کے سے انداز میں کہا، لیکن اگلے ہی لمحے شریف نے چھت سے چھلانگ لگا دی۔

''شری۔۔۔'' ہم چیختے ہوئے منڈیر تک آئے۔ صد شکر کہ منڈیر کے آگے ٹین کی شیٹ تھی، وہ اس پر کودا تھا اور اُس سے آگے چھلانگ لگا کر دوبارہ برآمدے میں پہنچ گیا۔ ہم ٹھہرے سدا کے ڈرپوک، اونچائی سے خوف کھانے والے، اُسکی اس حرکت پر تلماتے ہوئے ہوائی چپل ہاتھوں میں اٹھائی اور تاک کر برآمدہ پار کرتے شریف کی کمر کا نشانہ لیا۔ نشانہ چوکا مگر کمر سے نیچے جا لگا۔ دروازے پر موجود شریف

بلبلا کر اچھلا، پھر اپنے کولہے سہلاتے باہر بھاگ نکلا۔ ہم بھی زینہ پھلانگتے ہوئے برآمدے میں آئے اور اِسکے پیچھے گلی میں نکل پڑے۔ نام کا شریف ہمیں سرخ اینٹوں سے بنی مسجد کے باہر مصروف سے بازار میں لے آیا۔اسی طرح دو تین محلے کے چکّر کٹوانے کے بعد بلاآخر یہ تھینگا مشتی تھمی۔

اور ہم اور اپنی کمر سہلاتا شریف اب چوک سے قلفی خرید کر پارک میں بیٹھے کھا رہے تھے۔

''شرم نہ آئی ایسا کرتے ہوئے؟'' قلفی کے ساتھ انصاف کرتے ہم نے ناراضگی سے اُس سے پوچھا۔

''آئی تو تھی، پر ہم نے سلا دی۔اور ہمیں کیا معلوم تھا کہ ابّا ہمارے اتنے فرمانبردار ہیں کہ ایک ہی بار میں ہمارے مشورے پر عمل پیرا ہو جائیں گے۔''اُس نے قلفی کی ڈنڈی چاٹتے ہوئے کہا۔

''کہا کیا تھا تم نے ابّا سے؟''

''بس! اتنا ہی کہا تھا کہ بڑے بھیّا چندا کو بچپن سے پسند کرتے ہیں۔''اُس نے ڈنڈی برابر میں لگے کوڑے دان میں پھینکتے ہوئے کہا۔

''تم نے یہ کہا؟''مارے حیرت کے ہمارا منہ ہی کھل گیا۔

''ہاں! اور یہ بھی کہ بچپن میں جب چندا کی ناک بہتی تھی تو بھیّا اپنی قمیض کے دامن سے پونچھا کرتے تھے۔''اگلے ہی لمحے ایک زوردار دھپ ہم نے اسکے کندھے پر جڑی تھی۔

''آہ۔۔۔ ہر وقت مار اماری نہ کیا کرو۔''وہ تڑپ اُٹھا۔

''بتا رہے ہیں ہم، چندا سے شادی نہیں کریں گے۔''ہم نے حتمی انداز میں کہا۔

''اور اگر ایسا ہو گیا تو کیا کریں گے؟''اُس نے ڈھٹائی سے پوچھا۔

''روزِ محشر تمہارا گریبان پکڑیں گے۔''

''روزِ محشر تو دور ہے، کل کا سوچو۔بھابھی جی قدم رنجا فرما رہی ہیں کل۔''

''خبر دار جو بھابھی بولا تو، تھپڑ لگا دیں گے تمہیں۔۔۔''ہم بگڑے۔

''بھیّا مکھن ہے بھا بھی ملائی۔۔۔

بھیّا مکھن ہے بھا بھی ملائی۔''ہمیں چڑانے کے لیے اُس نے لہک لہک کر گانا شروع کر دیا۔ ہم غصّے سے اُٹھ کر وہاں سے چلے گئے۔

----------+---------+--------

اگلے روز جب پھپھو کا قافلہ گھر کے دروازے پر لنگر انداز ہوا تو ہم نے کھڑی سے جھانک جھانک کر چندا کو دیکھنے کی کوشش کی، لیکن وہ برقعے اور نقاب میں لپٹی ہوئی آئی تھی، ہم دیکھ ہی نہ سکے۔ ہماری یہ جھانکا تانکی، نام کے شریف اور کام کے خبیث کی نظروں میں آ گئی، صبح سے بھیّا مکھن اور بھا بھی ملائی گا گا کر جینا حرام کر دیا۔ ہم جا کر پھپھو سے مل آئے۔ تب بھی چندا دکھائی نہ دی۔ شاید وہ کمرے میں تھی۔ دن گزر گیا اور چندا کو دیکھنے کی حسرت لیے ہم دفتر آ گئے۔ بس ایک جستجو تھی کہ نجانے کیسی ہو گی؟ خیر! دفتر سے واپسی آٹھ بجے ہوئی۔ گھر والے رات کا کھانا کھا کر فارغ ہو چکے تھے۔ یعنی چندا کو دیکھنے کا ایک اور موقع ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ ہم بیزار سا منہ بناتے باورچی خانے میں آ گئے تا کہ اپنے لیے کھانا نکال سکے۔ امّاں ہمارے لیے کھانا الگ سے گرم کر کے رکھ دیا کرتی تھیں۔ ابھی ہم کھانا لیکر پلٹے ہی تھے کہ سامنے سے کوئی نو عمر خاتون کچھ برتن وغیرہ ہاتھوں میں لیے باورچی خانے میں داخل ہوئیں۔ غالباً انہوں نے ہمیں دیکھا نہ تھا۔ لیکن جیسے ہی ہم پر نظریں پڑیں، وہ ڈر گئیں۔

''معاف کیجیے گا ہم نے آپکو دیکھا نہیں!''گھبرا کر وضاحت دی۔ سانولے چہرے پر شرمندگی سجائے، کاجل بھری آنکھوں کے ساتھ وہ من موہنی سی لڑکی سو فیصد چندا ہی تھی۔ اُسکا پراندہ غائب تھا اور شخصیت یکسر تبدیل ہو چکی تھی، اِس سے قبل کہ ہم کوئی جواب دیتے وہ برتن سلیب پر رکھ کر وہاں سے چلی گئی۔

----------+---------+--------

صبح صبح ہم اُٹھے تو برآمدے میں رکھی پرانی مسہری غائب تھی۔ یہ بوسیدہ حال مسہری امّاں کے جہیز کی یادگار تھی، اسی لیے اب تک گھر میں پڑی تھی۔ لیکن اب اسکا غائب ہونا حیران کن تھا کہ امّاں اسے کبھی گھر سے نکالنے نہ دیتی۔

''امّاں مسہری کہاں گئی؟''ہم نے امّاں سے پوچھتے ہوئے کنانکھیوں سے چندا کو دیکھا جو پودوں کو پانی دے رہی تھی۔ دوپٹے میں لپٹا سانولا سنولا چہرہ چمک رہا تھا۔

''وہ شریف چھت پر لے گیا ہے۔ کہہ رہا تھا کہ دھوپ لگائے گا۔'' امّاں نے بتایا۔

''مسہری کو؟'' ہم حیران ہوئے۔

''نہیں! مسہری پر بیٹھ کر خود کو۔'' امّاں نے سبزی کاٹتے مصروف سے لہجے میں کہا۔ ہم سر ہلاتے چھت پر آئے تو دیکھا شریف مسہری پر لیٹا دھوپ سینک رہا ہے۔

''شری۔۔۔'' ہم نے پاس جا کر پکارا۔

''یہ تم ہمیں ہمارے نام سے بلایا کرو۔ کیا شری شری کرتے رہتے ہو؟'' اُس نے بگڑ کر کہا۔

''تمہاری حرکتیں تمہارے اسمِ گرامی سے میل نہیں کھاتی ہیں۔'' ہم جتاتے ہوئے مسہری پر اُسکے پیروں کے قریب بیٹھ گئے۔ سرما کی دھوپ بہت بھلی معلوم ہو رہی تھی۔

''تم کیوں پریشان ہو؟'' شریف نے ہمارا اُترا چہرہ دیکھ کر پوچھا۔

''وہ۔۔۔ پھپھو کو آئے تین روز ہو گئے ہیں۔۔۔'' ہم ذرا جھجھکے۔

''تو؟''

''تو یہ کہ ابّا نے وہ بات نہیں کی جو کرنے بلایا تھا اُنہیں۔'' ہم نے ذرا محتاط انداز میں کہا، حالانکہ سامنے بیٹھا شخص کسی طور بھروسے کے لائق نہ تھا لیکن کیا کرتے؟ سن گن لینے کے لئے بھی یہی بندہ مناسب تھا۔

''ابّا حضور نے فیصلہ تبدیل کر لیا ہے۔'' اُس نے ایک نیا بم سر پر گرایا۔

''کیا؟ پر کیوں؟'' ہم اُچھل پڑے۔ اُس نے آنکھوں پر سے بازو ہٹاتے ہمیں بغور دیکھا اور اُٹھ بیٹھا۔

''کیوں؟ آپکو تو خوش ہونا چاہیے نا؟'' وہ مشکوک ہوا۔

''ہمارا مطلب، اِس اچانک فیصلے کی وجہ؟'' ہم نے مصنوئی مسکراہٹ چہرے پر سجاتے ہوئے کہا حالانکہ دل تو ڈوب ہی رہا تھا۔

''ابّا نے پھپھو کو بلوایا اور محسوس کیا کہ پھپھو جائیداد والی بات تو کب کا بھول بھال گئی ہیں۔ اور ناراض بھی نہیں ہیں۔ لہٰذا انہوں نے فیصلہ کیا کہ چھوڑو اِس شادی وادی کے قصّے کو۔ جب پھپھو ایسے ہی ابّا سے راضی ہیں تو جائیداد کیوں دیں؟'' ابّا کی ابّا گردی کا واقعی کوئی ثانی نہ تھا۔

''حد ہے۔۔۔'' ہم واقعی سنجیدہ ہوئے۔

''آپ یہ بتاؤ! آپ کیا چاہتے ہو؟'' پہلی بار شریف سنجیدہ نظر آیا۔

''ہم جو بھی چاہتے ہوں، تم کونسا ہماری چاہت پوری کرنے پر قادر ہو؟'' ہمیں ہر شے پر غصّہ آرہا تھا۔

''ارے تم بتاؤ تو صحیح۔۔۔'' اُس نے اُکسایا۔

''ہم بس۔۔۔ چندا سے شادی پر راضی ہیں۔'' ہم نے کہا تو وہ بھونچکارہ گیا۔

''یعنی! اچھا بھلا ابّا نے زندگی میں کوئی نیک کام کرنے کا سوچا تھا۔ پھپھو کو بھی جائیداد میں سے حصہ مل جاتا۔ پر ابّا بھی نا!'' ہم نے ایسے ظاہر کیا جیسے ہماری اپنی پسند کا اِس میں کوئی عمل دخل ہی نہ ہو۔ البتہ نام کا شریف ہمیں گھور گھور کر دیکھتا رہا۔ ہم اُسکی نظروں سے بچنے کے لیے وہاں سے اٹھ گئے۔

----------+---------+--------

اُگلے دن ڈاک سے دوبارہ خط موصول ہوا۔ وہی ہلکے پیلے رنگ کے دبیز کاغذ پر سبز روشنائی سے تحریر کیا متن۔ اس بار تو ابّا حضور خط پڑھنے سے پہلے ہی گھبراہٹ کا شکار ہو گئے۔ سارا گھر ابّا کے گرد جمع ہو گیا اور اِس مرتبہ خط پڑھنے کا فرئضہ شریف نے انجام دیا۔

''بے شرم! کم ظرف!

بتایا بھی تھا کہ گنتی کے چند دن ہیں اور تم ہمارے پاس واپس آرہے ہو۔ لیکن موٹی عقل میں کوئی بات سماتی کیوں نہیں ہے تیرے؟ بہن کو اُسکا حصّہ دے، وہ بھی نقد رقم اُسکے ہاتھوں میں، اور ہماری پیاری نواسی کا ہاتھ ہمارے پوتے کے ہاتھ میں دے دے۔ یہ کر لے بدبخت! کیا معلوم عمر کچھ دراز ہو جائے؟''

پچھلے خط نے ابّا کا فشار خون بلند کیا تھا، پر اِس خط نے تو ایک سو چار بخار ہی چڑھا دیا۔ دو روز تک ابّا کا بخار اُترا ہی نہیں۔ عالم بیہوشی میں بہن سے ہاتھ جوڑ کر معافیاں بھی مانگیں اور بھانجی کا رشتہ بھی۔ پھپھو دونوں پر ہی راضی ہو گئیں۔ کچھ ہوش آیا تو ابّا کو غلطی کا احساس ہوا، ہمیں پاس بلا کر بولے۔

''سنو! ہم تمہیں نقد رقم دس ہزار دے رہے ہیں۔ بیوی کو حق مہر میں دے دینا۔ اچھی لڑکی ہے۔ بعد میں اُس سے واپس مانگ کر میرے حوالے کر دینا۔'' ابّا نے شاید ہمیں اپنی طرح سمجھ لیا تھا۔ فلحال تو ہم نے نقد رقم لیکر جیب میں رکھ لی، لیکن ہمارا ایسا کچھ بھی کرنے کا ارادہ نہ تھا۔

''کیا کہہ رہے تھے ابّا؟'' ہم کمرے میں آئے تو شریف نے پوچھا۔ وہ ہاتھ میں دادا جی کے دونوں خطوط لیے بیٹھا تھا۔

''اُنکو چھوڑو! تم یہ بتاؤ کہ یہ دادا حضور کا خط آخر تم ہی ارسال کر رہے ہو نا؟'' ہم نے کمر پر ہاتھ رکھتے ہوئے اُسے گھور کر دیکھا۔

''یہ ہر بار ہم پر ہی شک کرنے کیوں بیٹھ جاتے ہو؟'' وہ ناراض ہوا۔

''ان خطوط کا کیا کر رہے ہو؟'' ہم اُسکے سامنے رکھے، اپنے پلنگ پر بیٹھتے ہوئے بولے۔

''غور و خوص کر رہے ہیں۔ اس نوعیت کا کاغذ تو ہماری جامعہ نے سند دینے کے لیے بھی استعمال نہیں کیا۔ بڑا مہنگا اور عمدہ کاغذ لگتا ہے۔ پر یہ دادا جی کو قبر میں لا کر دے کون رہا ہے؟''

''کوئی دادا جی کا خط نہیں ہے یہ، گھر کا ہی کوئی فرد کر رہا ہے یقیناً!'' ہمیں ہرگز اِس بیوقوفی پر یقین نہ تھا۔

''ہم تو کر نہیں رہے ایسا، تمہارے پاس اتنی عقل ہے نہیں کہ ایسا منصوبہ تیار کرو۔ تو کہیں۔۔۔'' وہ رکا۔

''کیا؟'' ہم نے اپنی بے عزتی کو نظرانداز کرتے ہوئے متجسس لہجے میں پوچھا۔

''امّاں حضور؟'' اُس نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''لعنت تمہاری شکل پر۔۔۔'' ہم نے پانچوں اُنگلیاں کھول کر اسکے چہرے کی طرف کی تھیں۔ ''شرم نہیں آتی ہماری سادہ لوح امّاں پر الزام لگاتے ہوئے۔''

''تو پھر دادا جی ہی ہونگے۔''اُس نے ناک پر سے مکھی اُڑاتے ہوئے کہا۔

''جا رہے ہیں دفتر، ابّا کی طبیعت ذرا بھی خراب ہو تو فوراً ٹیلیفون کر دینا۔''ہم نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''سنو بھیّا!''شریف نے پکارا۔

''بھابھی کو تحفے میں دینے کے لیے رومال خرید لو، ناک پونچھنے کے لیے قمیض کچھ زیب نہیں دیتی۔''اُس نے شرارت سے کہا تو ہم نے تکیہ اُٹھا کر اُسے دے مارا اور باہر نکل گئے۔

''بھیّا مکھن ہے بھابھی ملائی۔۔۔''پیچھے اُسکے لہک لہک کر گانے کی آواز کانوں سے ٹکرائی تو چہرے پر مسکراہٹ رینگ گئی۔

----------+---------+--------

دو سال ایسے گزرے کہ معلوم ہی نہ ہوا۔ ابّا نے چٹ منگنی پٹ بیاہ کی مانند ہماری شادی کروادی تھی، چار سو کے مجمعے میں نکاح کی کارروائی مکمل ہونے سے عین قبل ہم نے مولوی صاحب سے حق مہر ہزار روپے لکھوایا کہ ہماری اتنی ہی استطاعت تھی۔ ابّا حضور جو دس ہزار کا مہر لکھوا کر لوگوں میں اپنی ناک اونچی کروانا چاہتے تھے، اُس لمحے ایک لفظ نہ بول سکے۔ اُس سے بھی بڑھ کر ہم نے یہ کیا کہ نقد دس ہزار روپے پھپھو کے ہاتھ میں رکھ دیے اور بولے۔

''پھپھو! آپ نے اپنا حصہ اِس لیے چھوڑا تھا کہ ہم باہر جا کر پڑھ سکے۔ آج ہم اِس قابل ہیں کہ آپ کو آپکا حصّہ لوٹا سکے۔ اور ابّا نے کہا تھا کہ کچھ بھی ہو جائے تم نے پھپھو کی امانت واپس کرنی ہی کرنی ہے۔''ہم نے ابّا کی لاج بھی رکھ لی اور پھپھو کا حق بھی انہیں دے دیا۔ ابّا کو تو ایسا صدمہ پہنچا کہ پوری شادی کچھ نہ بول سکے۔ تین ہفتوں تک تو گھر مہمانوں سے بھرا رہا، مہینے بھر بعد جا کر دعوتوں کا سلسلہ جو رکا تو ابّا ٹھیک ٹھاک چڑ چڑے ہو چکے تھے۔ بات بات پر ہمیں طعنے مارتے، اِس دوران شریف بھی ماسٹرز کے لیے انگلستان چلا گیا تھا۔ لہٰذا ہم ہی ابّا کے عتاب کا شکار ہوتے۔

دو سال گزر گئے پر ابّا کی ابّا گردی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ آج کل تو وہ چندا کو بھی خالی ہاتھ گھر آنے کا طعنہ دیتے کہ ہم نے جہیز لینے سے انکار کر دیا تھا۔ دادا جی کا کمرہ سیٹ کروا دیا گیا تھا اور اب وہ ہمارا تھا۔ چندا بھی بڑی صابر اور رکھ رکھاؤ والی تھی، ابّا کی باتوں کو در گزر کرتی رہتی، البتہ امّاں سے برداشت نہ ہوتا تو دو بدو ابّا کو جواب دیتیں۔ ہم کبھی کبھی سوچتے کہ چندا ابّا کی بھانجی ہے کہ امّاں کی؟

خیر! آج دو سال بعد شریف کو لینے کے لیے ہم ہوائی اڈے پہنچے تو ہماری سال بھر کی بیٹی بھی ہمارے ساتھ تھی، شریف نے خط بھیج کر تاکید کی تھی کہ اسکی بھتیجی کو لیکر آئیں کہ وہ اُس سے ملنے کے لیے بے قرار ہے۔ ہوائی اڈے پر جب شریف کی تشریف آوری ہوئی، تو وہ سب چھوڑ چھاڑ ہمارے گلے لگ گیا۔ پھر ہماری بیٹی کو گود سے لیکر خود میں بھینچ لیا، وہ اپنی آنکھیں کھولے ٹکر ٹکر اُسے دیکھتی رہی، پھر کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔ چچا بھتیجی کی اس محبت پر ہماری آنکھیں نم ہو گئیں۔

شریف کیا گھر واپس آیا گھر کی رونقیں لوٹ آئیں، اُسکے پاس سنانے کے لیے ڈھیروں قصے تھے۔ رات ہم اُسکے ساتھ چھت پر بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ اسے آئے تیسرا روز تھا، کل سے اُسے نوکری پر جانا تھا۔ جب سے آیا تھا ہماری گڈی اُسکے گود سے اُترتی ہی نہ تھی۔

''لگتا ہے تم پسند آ گئے ہو اسے۔۔۔'' ہم نے ہنستے ہوئے کہا۔

''اتنی پیاری ہے یہ۔۔۔ قسم سے بھیّا! اتنی محبت تو ہمیں تم سے بھی نہیں ہے، جتنی اِس سے محسوس ہوتی ہے۔'' اُس نے گڈی کو پیار کرتے ہوئے کہا، ہم ہنس دیئے۔

''ہمیں سمجھ نہیں آتی بھیّا! کیا ابّا کا دل پیسوں کی محبت سے اتنا بھر گیا ہے کہ اپنوں کی محبت گم ہو گئی ہے؟'' اُس نے اچانک ہی پوچھا۔

''ایسا کیوں کہہ رہے ہو؟''

''بھیّا! نمو یاد ہے۔ ناعمہ۔۔۔ ابّا کی یتیم بھتیجی؟ پہلے ہی باپ کی محبت نہیں ملی اُسے، کیا اُس کے لیے ابّا کے دل میں ذرا محبت نہیں جاگتی؟ کبھی پوچھتے بھی نہیں ہیں کہ وہ کس حال میں ہے؟'' اُس کی بات پر ہم لمحے بھر کو چپ ہوئے۔

''امّاں ٹیلیفون کرتی ہیں انہیں۔'' ہم نے بتایا۔

''ٹیلیفون سے کیا ہوتا ہے؟ انکا حصہ، دادا جی اپنی زندگی میں وصیت کر گئے تھے۔ وصیت کی اس خلاف ورزی کا وبال کہیں ہماری نسلیں نہ بھگتے۔''

''اللہ نہ کرے۔'' ہم نے دہل کر کہا۔ وہ خاموشی سے بیٹھا رہا، بات اُسکی درست تھی لیکن ابّا جی کا کیا ہی کریں؟

----------+---------+--------

اگلے روز وہ ہوا جو کسی کے تصوّر میں نہ تھا۔ دادا جی کا تیسرا اور آخری خط موصول ہوا۔ ابّا جو پچھلے دو سالوں میں دادا جی کو بھول بھال گئے تھے، نئے سرے سے کپکپانے لگے۔ اس مرتبہ ہلکے پیلے کاغذ اور سبز روشنائی سے لکھا متن پڑھنے کی ذمہ داری ہمیں ملی۔

''تف ہو تم پر۔ بیغیرت!

ہم نے کہا کہ بہن کو حصہ دے دو، تو عمر دراز ہو جائے شاید۔ بخار جو آیا تھا وہ تمہاری جان لے کر ہی ٹلتا، لیکن تمہارے گنتی کے نیک اعمال نے اُس وقت موت کو ٹال دیا۔ لیکن بد بخت! تُو پھر بھی نہ سمجھا؟ میری یتیم پوتی کتنی مشکلوں سے گزر بسر کر رہی ہے اور تُو ہے کہ اسکے حصے پر عیاشی کر رہا ہے؟ بس! اب بہت ہوا۔ میرے برابر والی زمین پر تیرے آنے کا بندوبست پورا کر لیا گیا ہے۔ اس بار کوئی رعایت نہیں! اب تو تُو دن گن لے، یہاں آنے پر ہی حساب ہو گا تجھ سے نا ہنجار!'' اب کہ تو ابّا تیورا کے گر پڑے۔ بڑی مشکلوں سے ہوش میں لایا گیا۔

ہوش میں آتے ہی شریف کو حکم دیا کہ وہ گھر کی سب سے بہترین گاڑی لے اور عزت اور اکرام کے ساتھ اُنکی بھابھی اور بھتیجی کو یہاں لیکر آئے۔ وہ تو خوشی خوشی گیا۔ جب واپس آیا تو ساتھ میں حیران پریشان سی تائی امّاں اور ناعمہ عرف نمو موجود تھیں۔

ابّا حضور نے خوب خاطر مدارت کی، پھر وکیل بلوا کر سب کے سامنے دکان نمو کے نام کر دی۔ تائی امّاں خوش تھیں اور ہم حیران کے دادا ابّا ہمیشہ اتنے بہترین وقت پر کیسے خط بھیج دیتے تھے؟ ان ساری باتوں کے بات ابّا نے ہتھیلی پر سرسوں جمائی اور شریف کے لیے نمو کا ہاتھ مانگ لیا۔ ہم نے حیرت سے شریف کی جانب دیکھا، وہ ایسا شرمایا کہ کچھ دیر کو ہمیں اُسکے مرد ہونے پر ہی شک ہو گیا۔ ایسی زنانہ اداکاری پر تو دل کیا کہ پیٹ ہی دیں اُسے۔

خیر! رات کو شریف ہی تائی امّاں اور نمو کو گھر چھوڑ کر واپس آیا۔

''ابّا! یہ فیصلہ اچانک کیسے کر لیا؟'' ہم نے محتاط انداز میں ابّا سے پوچھا۔

''دکان کا کرایہ نمو کے پاس آئیگا، اور بیوی کا پیسہ شوہر کا پیسہ۔۔۔'' ہم ہکا بکا رہ گئے جبکہ ابّا سکون سے اٹھ کر کمرے میں چلے گئے۔ ہم نے نام کے شریف کو دیکھا جو تاسف سے ابّا کو دیکھ رہا تھا۔

''ابّا کبھی نہیں سدھر سکتے۔'' اُس نے دکھ سے کہا۔

''ویسے شریف! آج ہمیں بتا ہی دو کہ یہ خطوط تم ہی لکھتے ہو نا؟ دو سال جب تم یہاں نہیں تھے، ایک خط نہ آیا پر جیسے ہی تم واپس آئے خط بھی چلا آیا۔'' آج کل اُسکی معقول حرکتوں کی وجہ سے ہم نے اُسے شری کہنا چھوڑ دیا تھا۔

''ہم ہاتھ جوڑتے ہیں تمہارے سامنے بھیّا! ہم نے ایسا کچھ نہیں کیا۔'' وہ بیزار ہوا۔

''خیر! ابّا کی باتوں کو نظرانداز کرو۔'' ہم نے نرمی سے کہا۔

''وہی کر رہے ہیں اتنے عرصے سے۔۔۔'' شریف منہ بناتے چائے پینے لگا۔

----------+---------+--------

دو روز کے لیے ہمیں لاہور جانا تھا، مرکزی شاہراہ جو شہر کو جوڑتی تھی، وہاں ہماری گاڑی کو اتنا شدید حادثہ پیش آیا کہ بیان نہیں کر سکتے۔ ہم تھے بھی اکیلے، رات کا وقت، آس پاس کوئی بھی نہ تھا۔ خون میں لپٹے ہم خود کو گھسیٹتے ایک درخت تک لائے۔ نجانے کتنی ہڈیاں ٹوٹی تھیں؟ کہاں کہاں چوٹ آئی تھی؟ سر میں درد الگ اُٹھ رہا تھا۔ اور آس پاس بچانے والا بھی کوئی نہ تھا سوائے رب کے۔۔۔ آنکھیں بند ہونے سے قبل ہم نے گڈی، چندا، شریف، امّاں اور ابّا کو یاد کیا۔ انہیں تو معلوم بھی نہیں ہو گا کہ ہم یہاں کس حال میں پڑے ہیں۔

جب آنکھ کھلی تو خود کو ہسپتال میں پایا، پاس ہی کرسی پر شریف سر جھکائے بیٹھا تھا، لگتا تھا جیسے کئی راتوں سے سویا نہ ہو۔

''ش۔۔شا۔۔۔شریف!'' ہم نے بڑی دقت سے اسکا نام لیا۔ اُس نے سر اُٹھا کر دیکھا اور تیزی سے ہمارے پاس آیا۔

''بھیّا! تمہیں ہوش آگیا؟ تم ٹھیک ہو؟'' وہ جذباتی ہونے لگا۔

''ہم ڈاکٹر کو بلاتے ہیں۔'' وہ بھاگتا ہوا باہر گیا، زندگی میں پہلی بار ہمیں اپنے ماں جائے پر ٹوٹ کر پیار آیا تھا۔ صد شکر کہ ہم دونوں نے ابّا کی اولاد ہونے کے باوجود پیسوں کی محبت ورثے میں نہ لی تھی۔

معالج آیا تو معلوم ہوا کہ ہم چار روز سے ہسپتال میں بیہوش پڑے تھے، جائے حادثہ پر کسی مال پہنچنے والے ٹرک کے ڈرائیور نے ہمیں دیکھ لیا تھا۔ وہی لایا تھا یہاں تک۔۔۔۔

''ابّا وغیرہ کو اطلاع کر دی ہے۔ آتے ہی ہونگے کچھ دیر میں۔'' معالج معائنہ کر کے چلا گیا تو شریف نے بتایا۔

''ابّا کیسے ہیں؟''ہم نے نقاہت زدہ لہجے میں پوچھا۔

''سدھرے ہوئے ہیں آج کل، غریبوں کو بھر بھر کر کھانا کھلاتے ہیں، پڑوسیوں کو خود سے سلام کرتے ہیں اور تمہارے لیے دعا کرنے کو کہتے ہیں۔ چندا بھابھی اور نمو کو بلا کر گلے لگایا اور کہنے لگے تم دونوں میری اپنی بیٹیاں ہو۔''اگر وہ سنجیدہ نہ ہوتا تو ہم سمجھتے وہ مذاق کر رہا ہے۔ پر ابّا کے رویے نے اسکی بات کی تصدیق کر دی۔

کچھ روز بعد ہمیں ہسپتال سے چھٹی ملی تو ہمیں نچلی منزل پر ہمارے اور شریف کے مشترکہ کمرے میں لایا گیا کہ ہمارا ذاتی کمرہ بالائی منزل پر تھا اور ہم ابھی زینے چڑھنے کے قابل نہ تھے۔ شریف کے بیرونِ ملک قیام کے دوران یہ کمرہ ہمارے دفتری کاموں کے لیے زیرِ استعمال رہا تھا۔ اب بھی ساتھ والی چھوٹی میز پر ہمارے کاغذات، کاپیاں اور قلم وغیرہ رکھے تھے۔

''آپ نیچے رہیں گے، کسی چیز کی ضرورت ہوئی تو ہمیں کیسے آواز دیں گے؟''چندا پریشان ہوئی۔

''بھابھی جی! ہم ہیں نا! اِس کا خیال ساری زندگی رکھا ہی کس نے ہے سوائے ہمارے؟''شریف کی اِس مبالغہ آرائی پر ہم نے تڑپ کر اُسے دیکھا۔

''بس کر دو! کبھی ایک پانی کا گلاس تک تو ہمیں لا کر دیا نہیں تم نے۔''ہم نے کہا، اِس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتا، ابّا حضور کی تشریف آوری ہو گئی۔

''کیسے ہو میاں؟''وہ ہمارے سامنے رکھی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولے۔

''الحمدُ اللہ!''ہم نے کہا۔

''شکر ہے کہ تم ٹھیک ہو، حادثہ بڑا خطرناک تھا۔ تمہارے بچ جانے پر سارا ہسپتال حیران تھا۔''ابّا حضور نے بتایا۔

''ہاں! تھا تو واقعی خطرناک۔۔۔ پر ایک بات کہیں ابّا؟''ہم نے انہیں غور سے دیکھتے پوچھا۔

''ہاں! کہو!''

''ابّاحادثے کے وقت ہماری جیب میں اچھی خاصی نقدرقم تھی، کچھ بینک کے چیک بھی تھے، ساتھ ایک سونے کی انگوٹھی تھی، جو چندا نے ہماری جیب میں رکھوائی تھی اور لینا بھول گئی تھی۔ یہ ساری چیزیں تھی ہمارے پاس۔۔۔ لیکن جانتے ہیں ابّا، اُس لمحے ایک چیز ہمارے کام نہ آئی۔ نہ کوئی نقدرقم ہمارا بہتا خون روک سکی، نہ کسی سونے کے زیور نے ہمیں پانی کا ایک قطرہ ہی لا کر دے دیا۔ اُس لمحے ابّا! دنیا کی بیکار ترین شے ہمارے جیب میں موجود مال تھا۔'' ہم کہہ رہے تھے اور ابّا دم بخود سن رہے تھے۔

''اگر کسی نے ہماری جان بچائی تو وہ تھی سب کی دعائیں، اور شاید ہمارے گنتی کے کچھ نیک اعمال۔ سوچیں ابّا! جو دولت دنیا میں ہمارے کام نہ آسکی، وہ قبر میں کیسے کام آئے گی؟ جبکہ کفن میں تو جیبیں بھی نہیں ہوتیں۔ تو ان چند روپے کے لیے اللہ کے احکامات توڑنا، کسی کا حق مارنا، ناانصافی کرنا یا کسی کا دل دکھانا کہاں کی عقلمندی ہے؟'' ہم نے پوچھا، اور شاید جو بات دادا حضور کے خطوط انہیں نہ سمجھا سکے، وہ ہماری تقریر نے سمجھا دی تھی۔

''یہ بات تو ہمیں اُسی وقت سمجھ آگئی تھی بیٹا! جب ڈاکٹروں نے کہا کہ تمہیں دنیا کی کوئی شے ہوش میں نہیں لاسکتی سوائے دعاؤں کے، اُس لمحے ہم نے ڈاکٹروں سے کہا کہ جتنا پیسہ چاہیے ہم دیں گے، ہمارے بیٹے کو بچالیں۔ اُنہوں نے کہا کہ پیسوں کا کیا کرنا ہے، جب اسکی جان صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ بس! اسی لمحے ہمیں پیسوں کی اصلیت سمجھ آگئی تھی بیٹا!'' ابّا حضور نے کھلے دل سے اعتراف کیا تو ہمارے دل میں یک گونہ سکون اُتر آیا کہ چلو ابّا کی ابّا گردی کا اختتام ہوا۔

''چلو! اب تم آرام کرو۔'' ابّا حضور ہماری کام والی میز کا سہارا لیکر اٹھنے لگے۔ اور اسی لمحے میز پر رکھا سامان پھسل کر زمین بوس ہوا۔

ہم نے گھبرا کر فرش کی طرح دیکھا تو وہاں کاپیوں اور رجسٹروں کے درمیان ڈھیر سارے، ہلکے پیلے رنگ کے کورے کورے دبیز کاغذ پڑے تھے، ساتھ گرا قلم کا ڈھکن کھل کر اپنی سبز روشنائی سے اُسے تر کرتا ہمارے مستقبل کو سیاہ کر گیا تھا۔

اور پھر چراغوں میں روشنی نہ رہی۔

----------+---------+--------

(ختم شد)